واقعۂ یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ابن تیمیہ کی تقریر

مدیر ایقاظ

ہمارے کچھ نہایت عزیز اور قابل احترام دوستوں کی جانب سے ایقاظ اپریل 2013 کے مضمون "درمیانی مرحلہ کے بعض احکام" کی بابت ہمیں ایک اشکال موصول ہوا ہے جس کا تعلق یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ہے۔ لب لباب اس کا یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بادشاہِ مصر کے ہاں عہدہ اختیار کرنے کے حوالے سے ہمارا وہ استدلال کرنا درست نہیں ہے، جس کی بڑی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ اُن امور میں سے ہے جو پچھلی شریعتوں سے متعلق ہیں اور اس کی مثال سجدۂ تعظیمی جیسی ہے جو کہ پچھلی بعض شریعتوں میں بے شک مباح تھا مگر ہماری شریعت میں بالاتفاق منسوخ اور حرام ہے۔

ایک دوسری وجہ بھی بیان کی گئی اور وہ یہ کہ بعض تفاسیر میں مجاہدؒ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر یہ دلیل درخورِ اعتناء اُس وقت ہوتی جب یہ طے ہوتا کہ یوسف علیہ السلام نے عہدہ اُس وقت تک طلب نہیں فرمایا جب تک بادشاہ نے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان نہیں کر دیا، ظاہر ہے اس پر کوئی دلیل نہیں۔ قرآن کی اس آیت { وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حتىٰ إِذَا هلكَ قُلْتُم لَن يَبْعَثَ اللهُ مِن بعْدِهِ رَسُوْلاً (سورۃ غافر:34) "اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس آیا تھا دلیلیں لے کر پھر تم اس کی لائی ہوئی (دلیلوں) کی بابت شک ہی میں رہے، پھر جب وہ دنیا سے چلا گیا تو تم نے کہا یوسف کے بعد تو اللہ کوئی رسول بھیجنے والا ہی نہیں"} سے ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام اہل مصر کو مسلسل اسلام کی دعوت دیتے رہے لیکن مصر کی ایک بڑی اکثریت بڑی دیر تک آپؑ پر ایمان لے کر نہ آئی؛ کوئی کسی مرحلہ پر ایمان لایا تو کوئی کسی مرحلہ پر۔ بادشاہ کس مرحلہ پہ جا کر ایمان لایا (بشرطِ روایت مجاہد)، اس کی بہر حال تعیین

ممکن نہیں۔ تاہم اس مسئلہ کے حوالے سے بھی، اور اُس اصل نقطے کے حوالے سے بھی جو اشکال کے شروع میں بیان ہوا، یہاں فی الحال ہم ایک مختصر بنیاد اختیار کریں گے:

یقیناً یہاں ایسے حضرات موجود ہیں جو مدرسۂ ابن تیمیہ کا کوئی علمی وزن تسلیم نہیں کرتے، اور ظاہر ہے ان کے ساتھ ہمیں گفتگو کا ایک دوسرا اسلوب ہی اختیار کرنا ہو گا۔ لیکن جن حضرات کو ہم نے شروعِ گفتگو میں اپنے عزیز قابل احترام دوست کہا ہے ہمارے گمان میں وہ مدرسۂ ابن تیمیہ کو ویسا ہی وزن اور اہمیت دیتے ہیں جو خود ہمارے ہاں دی جاتی ہے۔ اس لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے فی الحال ہم اس مسئلہ کو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی توضیحات کی طرف لوٹا دینا زیادہ مناسب اور مختصر سمجھیں گے۔ اس کے جواب میں ہمارے معترض پھر بھی یہ بنیاد اختیار کر سکتے ہیں کہ ابن تیمیہ کوئی غلطی سے معصوم شخصیت نہیں ہیں۔ یقیناً ابن تیمیہ کے ساتھ اختلاف کی گنجائش ہر جگہ موجود ہے، اور ہمارے یہ معزز بھائی اگر ایسی کوئی رائے اختیار کرنا چاہیں تو یہ فی نفسہٖ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ البتہ ہم اپنے بیان کردہ مقدمہ کے ایضاح میں فی الحال جس بات پر اکتفاء کرنا چاہیں گے وہ یہ کہ:

1. سجدۂ تعظیمی کا ہماری شریعت میں منسوخ ہو جانے کا ذکر نصوصِ شریعت کے علاوہ متقدمین و متاخرین اہل علم کے بیان میں جابجا ملتا ہے۔ تاہم ہمارے اِس زیر بحث مسئلہ (کافر بادشاہ کے ہاں کوئی بااختیار عہدہ رکھنا) میں اگر ہماری شریعت کے اندر کوئی نسخ ہو گیا ہے تو وہ بہر حال ابن تیمیہ ایسے کبار ائمہ علم تک پر مخفی ہے، کیونکہ ابن تیمیہ یہاں یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے ہماری امت کو درپیش مسائل پر ہی استدلال فرما رہے ہیں، جیسا کہ ابھی آگے چل کر آپ دیکھیں گے۔ کم از کم بھی یہ کہنا چاہئے کہ ابن تیمیہ ہمارے معترض کی بیان کردہ کسی رائے کو قابل اعتناء نہیں جانتے۔ {یہاں یہ ذکر کرنا خالی از فائدہ نہ ہو گا کہ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں سورۂ یوسف کی اِنہی آیات کے تحت اس مسئلہ کو اٹھایا ضرور ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ ایک رائے یہ ہے کہ ایک فاجر یا کافر سلطان کے ہاں ایک صالح آدمی کا بااختیار منصب قبول کرنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ خاص تھا مگر آج

ہمارے لیے یہ جائز نہیں، تاہم یہ رائے نقل کر دینے کے بعد قرطبی خود ہی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس رائے کی نسبت دوسری رائے (جو کہ ہم آگے چل کر ابن تیمیہ کے ہاں دیکھیں گے) ہی زیادہ صحیح ہے۔ اس لحاظ سے ہم اپنے معترض کے لیے اتنی سی گنجائش خود ہی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کی یہ رائے جسے ابن تیمیہ قابل ذکر تک نہیں جانتے اور جسے قرطبی بھی صرف ذکر کرتے ہیں البتہ راجح وہ بھی نہیں مانتے، کسی نہ کسی حد تک "ایک رائے" ضرور کہی جاسکتی ہے جو پرانے علماء میں سے بھی کسی کے ہاں اختیار کر لی گئی ہو گی۔ لہٰذا ہمارے یہ بھائی اسی ضعیف رائے کو اپنے لیے درست سمجھتے ہیں تو ہمیں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں۔} ہم یہاں ابن تیمیہ کی جو تقریر پیش کرنے جا رہے ہیں، اُس سے ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ امت کے نہایت فاضل ائمہ نے یہی رائے اختیار کیے رکھی ہے جو ہمارے اولین مضمون[1] میں بیان ہوئی۔

2. ابن تیمیہ کے کلام سے ہمارے اِس استشہاد کے جواب میں یقیناً کوئی صاحب یہ نکتہ اٹھا سکتے ہیں کہ ابن تیمیہ جن بااختیار مناصب[2] کے قبول کرنے کے حوالے سے فتویٰ دے رہے ہیں وہ مجموعی طور پر ایک 'اسلامی نظام' کے اندر پائے جاتے تھے جن کے اندر بہت سا ظلم اور فساد در آیا تھا، نہ کہ وہ کافرانہ نظام جو آج ہمیں درپیش ہے، لہٰذا ابن تیمیہؒ کے کلام سے اپنی آج کی صورتحال پر دلیل لے کر ہم نے پھر بھی زیادتی کر لی ہے کیونکہ ابن تیمیہ کے وہ جوابات ایک ظالمانہ نظام سے متعلق ہیں جبکہ ہمیں درپیش صورتحال ایک کافرانہ نظام سے متعلق ہے۔ اصولاً، خود ہم اس بات کے شدید مخالف ہیں کہ اپنے مسلم سلاطینِ بنوامیہ یا بنوعباس یا ممالیک وغیرہ کے ہاں رائج صورتحال کو آج کے اِن طاغوتی سلسلوں کے ساتھ قیاس کروایا جائے اور ہر دو کے حکم کو ایک کر دینے کو 'سلف کے منہج' کے تحت بیان کیا جائے؛ ہماری تحریروں میں جابجا اس کو زیادتی قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ واقعتاً ظلمِ عظیم ہے کہ (اپنی اسلامی تاریخ میں) ماضی کے اُس ظلم اور حال کے اِس کفر کا فرق ختم کرا دیا جائے۔ تاہم ہمارے اِس زیر بحث مسئلہ میں، جیسا کہ آپ ابن تیمیہ کے کلام میں دیکھیں گے، خود ابن تیمیہؒ ہی

اپنے دور کے ظالم یا فاجر سلاطین کے ہاں اختیار کیے جانے والے بااختیار مناصب کے درست ہونے پر دلیل قصۂ یوسف علیہ السلام سے لیتے ہیں اور تصریح فرماتے ہیں کہ بادشاہِ مصر اور اس کی قوم کفار تھے جہاں یوسف علیہ السلام نے یہ بااختیار منصب قبول فرمایا۔

*****

ہماری یہ بحث کیونکر سامنے آئی؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئے قاری پر یہ بات بھی ذرا واضح کرتے چلیں...

دراصل یہاں کی تحریکی دنیا کے لیے ہم ایک مقدمہ رکھتے ہیں اور اس کو جابجا بیان کرتے ہیں اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ:

آپ کے سامنے خواہ ایک مسلم معاشرہ ہے یا ایک کافر معاشرہ، ایک مسلم سلطان ہے یا ایک کافر یا فاجر حکمران، وقت کے صالحین کا وہاں کے اداروں سے اٹھ آنا اور وہاں اثر ورسوخ کی پوزیشنوں کو چھوڑ آنا ہرگز ہرگز دینِ خداوندی کا تقاضا نہیں۔ یہ منہج کچھ واضح عمرانی حقائق سے بھی متصادم ہے اور معلوم شرعی حقائق سے بھی۔ (ظاہر ہے شرعی حقائق عمرانی حقائق کے ساتھ بہترین تعامل اختیار کرنے کے لیے ہی آتے ہیں نہ کہ ان کو نظر انداز کروانے یا ان کے ساتھ تصادم اختیار کروانے کے لیے، اسی لیے ہم نے اپنے اولین مضمون میں کہا تھا کہ ہمارے فقہاء اپنے دور کے اعلیٰ ترین سوشل سائنٹسٹ رہے ہیں)۔

اب چونکہ یہ مقدمہ ہی سرے سے غلط ہے کہ کسی معاشرے یا کسی نظام کے کافرانہ ہونے کے باعث وہاں کے اداروں اور وہاں کے بااختیار مناصب سے ہاتھ جھاڑ کر اور وہاں اثر ورسوخ کی اعلیٰ پوزیشنوں کو چھوڑ چھاڑ کر گھر آبیٹھنا دینِ خداوندی کا تقاضا ہے... لہٰذا ہاتھ گھما کر کان پکڑنے کی یہ مشقت سرے سے غیر ضروری ہو جاتی ہے کہ کسی معاشرے یا کسی نظام میں ایک اچھی بااثر پوزیشن پر پائے جانے کا "جواز" پیدا کرنے کے لیے آپ اُس نظام کو کھینچ تان کر 'اسلامی' ثابت کرلیں، جیسا کہ مودودی صاحبؒ کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے۔ یہاں سے؛ یوسف علیہ السلام کا بادشاہِ مصر کے ہاں ایک اعلیٰ ترین عہدہ قبول فرمانا بلکہ خود وہ عہدہ طلب

فرمالینا اور وہاں سے بالآخر ایک پورے ملک کو (مصر، تہذیب کا ایک قدیم ترین گڑھ) کو اسلام کی پٹڑی پر چڑھالانا ہمارے اُس بیان[3] کے اندر مذکور ہو گیا تھا، جس پر یہ اعتراض وارد ہوا۔

اللہ کا شکر ہے مدرسۂ امام ابن تیمیہؒ اس موضوع پر آپ کو معاشرے پر اثرانداز ہونے... اور بدترین سے بدترین حالات میں بھی یہاں صالحین کے اعلیٰ کردار ادا کر جانے اور اونچی سے اونچی پوزیشنوں پہ پہنچ کر مقاصدِ حق کو انجام دے لینے... کے حوالے سے وہ ڈائنامزم فراہم کرتا ہے جو امام مودودیؒ کے اُس منہج میں ہمیں مفقود نظر آتا ہے جس کا فارمیٹ (ہمارے اندازے کے مطابق) مودودی کے ذہن پر سوشلسٹ موومنٹس کے سٹرکچر سے کسی نادانستہ انداز میں مرتسم ہو گیا تھا اور جو کہ ہماری نظر میں بہرحال ایک بانجھ منہج ہے۔ جبکہ ہمارے علمائے عقیدہ کے ہاں مودودیؒ کے بیان کردہ اِن مباحث[4] کی سرے سے گنجائش نہیں رہی تھی بلکہ اُن (علمائے عقیدہ کے بیان کردہ مباحث) کی سادگی اور بے ساختگی اپنے اسلوب میں ہی مودودی صاحب کے اختیار کردہ اِن تکلفات سے اچھا خاصا اِباء کرتی ہے۔ ہم اپنے اُس مضمون[5] میں بھی یہ بات بیان کر آئے ہیں کہ ایک حقیقی اور زوردار تحریکی عمل ہونے کے ناطے سید مودودی کو جو اعلیٰ جمعیت دستیاب ہو گئی تھی، معاشرے پر اثرانداز ہونے کے حوالے سے وہ زیادہ دیر معاشرے کے اندر قائم اداروں سے الگ تھلگ رہ ہی نہیں سکتی تھی اور اگر ایسا کرتی تو کچھ معلوم عمرانی حقیقتوں سے تصادم کرتی۔[6] عمرانی حقیقتوں کے ساتھ اپنے اِس تصادم سے بچنے کے لیے سید مودودی کی اُس جمعیت پر سرے سے ضروری نہ تھا کہ ایک اچھا خاصا تکلف کر کے وہ رائج جمہوری نظام کو مشرف بہ اسلام بناتی تاکہ یہاں کے اداروں میں اُس باصلاحیت جمعیت کے پائے جانے کی راہ میں جو ایک "اصولی رکاوٹ" حائل تھی وہ دور ہو جائے! حضرات یہ ہے وہ ڈائنامزم جو ہمیں ابن تیمیہؒ کا مدرسہ سلفیہ دیتا ہے اور جس کے سامنے لے آئے جانے کی صورت میں:

1. ہمارے باصلاحیت نوجوان باطل کی اس یلغار کے مقابلے پر اپنے عقیدہ پر استقامت اور ثابت قدمی[7] اختیار کر رکھنے میں بھی ہرگز کوئی رکاوٹ نہیں پائیں گے (کسی ایسے ری کونسائل کی گنجائش ہی ان شاء اللہ نہیں رہے گی جو اِس جمہوری پیراڈائم کو اختیار

کرنے کے معاملے میں بالآخر جماعت اسلامی اور اخوان کے پاؤں کی زنجیر بنی اور ان کے اسلام کی ایک ٹھیٹ پریزنٹیشن اپنا رکھنے میں مانع بنتی چلی گئی؛ نوبت بایںجا رسید کہ ان کے ہاں ''نفاذِ شریعت'' کا مقدمہ بھی اب تقریباً دم توڑ گیا ہے، یا کم از کم بھی کہنا چاہئے کہ وہ ان کے 'مطالبات' اور ان کی علانیہ جدوجہد کے 'بنیادی نکات' کی فہرست میں خاصا نیچے جا چکا ہے اور 'لوڈشیڈنگ'، 'کرپشن' اور 'مہنگائی' وغیرہ ایسے 'حقیقی مسائل' اس کے مقابلے پر فہرست میں خاصا اوپر جگہ پا چکے ہیں)،

2. اور دوسری جانب معاشرے کی بااثر سے بااثر پوزیشن اختیار کر کے اپنی ایک معاشرتی پیش قدمی کو جاری رکھنے میں بھی ہمارے یہ نوجوان کوئی رکاوٹ نہیں پائیں گے۔

یہ مدرسہ ابن تیمیہ، جس کے فی زمانہ اعلیٰ ترین ترجمان ہماری نگاہ میں شیخ سفر الحوالی ہیں، یہاں کی بے شمار تحریکی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھاتا ہے۔ اس مدرسہ کو ہم یہاں کی تحریکی دنیا کے اندر جگہ دلوانے پر اگر محنت کر رہے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہاں کی یہی ضرورت ہے۔ اسی مبحث کے چند جوانب ہمارے اپریل 2012 کے شمارے میں دیے گئے شیخ صالح المنجد کے ایک فتویٰ[8] میں واضح کیے گئے ہیں۔ بلکہ ہمارے اُس پورے شمارے کا مین تھیم مدرسہ سلفیہ کا یہی مبحث ہے، خصوصاً اُس شمارہ کا ہمارا ایک مضمون: ''دین سے وابستہ نوجوان... معاشروں سے فرار؟''[9]

*****

اب ہم آتے ہیں امام ابن تیمیہ کے اس بیان کی طرف جو کہ ان کے مجموع فتاویٰ کے ایک سنہرے مبحث ''في تعارض الحسنات أو السيئات أو هما جميعاً'' سے اقتباس ہے۔ ان شاء اللہ ہم کسی آئندہ فرصت میں مجموع فتاوی میں بیان ہونے والے اس پورے مبحث ہی کو اردو استفادہ کی صورت میں پیش کریں گے اور اس کے چند مقامات کو کھولنے کی بھی کوشش کریں گے، فی الحال اس کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے:

ثُمَّ السُّلْطَانُ يُؤَاخَذُ عَلَى مَا يَفْعَلُهُ مِنْ الْعُدْوَانِ وَيُفَرِّطُ فِيهِ مِنْ الْحُقُوقِ مَعَ التَّمَكُّنِ لَكِنْ أَقُولُ هُنَا؛ إذَا كَانَ الْمُتَوَلِّي لِلسُّلْطَانِ الْعَامِّ أَوْ بَعْضَ فُرُوعِهِ كَالْإِمَارَةِ وَالْوِلَايَةِ وَالْقَضَاءِ وَنَحْوُ

ذَلِكَ إذَا كَانَ لَا يُمْكِنُهُ أَدَاءُ وَاجِبَاتِهِ وَتَرْكُ مُحَرَّمَاتِهِ وَلَكِنْ يَتَعَمَّدُ ذَلِكَ مَا لَا يَفْعَلُهُ غَيْرُهُ قَصْدًا وَقُدْرَةً: جَازَتْ لَهُ الْوِلَايَةُ وَرُبَّمَا وَجَبَتْ وَذَلِكَ لِأَنَّ الْوِلَايَةَ إذَا كَانَتْ مِنْ الْوَاجِبَاتِ الَّتِي يَجِبُ تَحْصِيلُ مَصَالِحِهَا مِنْ جِهَادِ الْعَدُوِّ وَقَسْمِ الْفَيْءِ وَإِقَامَةِ الْحُدُودِ وَأَمْنِ السَّبِيلِ: كَانَ فِعْلُهَا وَاجِبًا فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ مُسْتَلْزِمًا لِتَوْلِيَةِ بَعْضِ مَنْ لَا يَسْتَحِقُّ وَأَخْذِ بَعْضِ مَا لَا يَحِلُّ وَإِعْطَاءِ بَعْضِ مَنْ لَا يَنْبَغِي؛ وَلَا يُمْكِنُهُ تَرْكُ ذَلِكَ: صَارَ هَذَا مِنْ بَابِ مَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ أَوْ الْمُسْتَحَبُّ إلَّا بِهِ فَيَكُونُ وَاجِبًا أَوْ مُسْتَحَبًّا إذَا كَانَتْ مَفْسَدَتُهُ دُونَ مَصْلَحَةِ ذَلِكَ الْوَاجِبِ أَوْ الْمُسْتَحَبِّ بَلْ لَوْ كَانَتْ الْوِلَايَةُ غَيْرَ وَاجِبَةٍ وَهِيَ مُشْتَمِلَةٌ عَلَى ظُلْمٍ؛ وَمَنْ تَوَلَّاهَا أَقَامَ الظُّلْمَ حَتَّى تَوَلَّاهَا شَخْصٌ قَصْدُهُ بِذَلِكَ تَخْفِيفُ الظُّلْمِ فِيهَا. وَدَفْعُ أَكْثَرِهِ بِاحْتِمَالِ أَيْسَرِهِ: كَانَ ذَلِكَ حَسَنًا مَعَ هَذِهِ النِّيَّةِ وَكَانَ فِعْلُهُ لِمَا يَفْعَلُهُ مِنْ السَّيِّئَةِ بِنِيَّةِ دَفْعِ مَا هُوَ أَشَدُّ مِنْهَا جَيِّدًا. وَهَذَا بَابٌ يَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ النِّيَّاتِ وَالْمَقَاصِدِ فَمَنْ طَلَبَ مِنْهُ ظَالِمٌ قَادِرٌ وَأَلْزَمَهُ مَالًا فَتَوَسَّطَ رَجُلٌ بَيْنَهُمَا لِيَدْفَعَ عَنْ الْمَظْلُومِ كَثْرَةَ الظُّلْمِ وَأَخَذَ مِنْهُ وَأَعْطَى الظَّالِمَ مَعَ اخْتِيَارِهِ أَنْ لَا يَظْلِمَ وَدَفْعَهُ ذَلِكَ لَوْ أَمْكَنَ: كَانَ مُحْسِنًا وَلَوْ تَوَسَّطَ إعَانَةً لِلظَّالِمِ كَانَ مُسِيئًا. وَإِنَّمَا الْغَالِبُ فِي هَذِهِ الْأَشْيَاءِ فَسَادُ النِّيَّةِ وَالْعَمَلِ أَمَّا النِّيَّةُ فَبِقَصْدِهِ السُّلْطَانَ وَالْمَالَ وَأَمَّا الْعَمَلُ فَبِفِعْلِ الْمُحَرَّمَاتِ وَبِتَرْكِ الْوَاجِبَاتِ لَا لِأَجْلِ التَّعَارُضِ وَلَا لِقَصْدِ الْأَنْفَعِ وَالْأَصْلَحِ. ثُمَّ الْوِلَايَةُ وَإِنْ كَانَتْ جَائِزَةً أَوْ مُسْتَحَبَّةً أَوْ وَاجِبَةً فَقَدْ يَكُونُ فِي حَقِّ الرَّجُلِ الْمُعَيَّنِ غَيْرُهَا أَوْجَبُ. أَوْ أَحَبُّ فَيُقَدَّمُ حِينَئِذٍ خَيْرُ الْخَيْرَيْنِ وُجُوبًا تَارَةً وَاسْتِحْبَابًا أُخْرَى. وَمِنْ هَذَا الْبَابِ تَوَلِّي يُوسُفَ الصِّدِّيقِ عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ لِمَلِكِ مِصْرَ بَلْ وَمَسْأَلَتُهُ أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ وَكَانَ هُوَ وَقَوْمُهُ كُفَّارًا كَمَا قَالَ تَعَالَى: {وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ} الْآيَةَ وَقَالَ تَعَالَى عَنْهُ: {يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ} {مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ} الْآيَةَ وَمَعْلُومٌ أَنَّهُ مَعَ كُفْرِهِمْ لَا بُدَّ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ عَادَةٌ وَسُنَّةٌ فِي قَبْضِ الْأَمْوَالِ وَصَرْفِهَا عَلَى حَاشِيَةِ الْمَلِكِ وَأَهْلِ بَيْتِهِ وَجُنْدِهِ وَرَعِيَّتِهِ وَلَا تَكُونُ تِلْكَ جَارِيَةً عَلَى سُنَّةِ الْأَنْبِيَاءِ وَعَدْلِهِمْ وَلَمْ يَكُنْ يُوسُفُ يُمْكِنُهُ أَنْ يَفْعَلَ كُلَّ مَا يُرِيدُ وَهُوَ مَا يَرَاهُ مِنْ دِينِ اللَّهِ فَإِنَّ الْقَوْمَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَكِنْ فَعَلَ الْمُمْكِنَ مِنْ الْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَنَالَ بِالسُّلْطَانِ مِنْ إكْرَامِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ مَا لَمْ يَكُنْ يُمْكِنُ أَنْ يَنَالَهُ بِدُونِ ذَلِكَ وَهَذَا كُلُّهُ دَاخِلٌ فِي قَوْلِهِ: {فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ} . فإذا ازْدَحَمَ وَاجِبَانِ لَا يُمْكِنُ جَمْعُهُمَا فَقُدِّمَ أَوْكَدُهُمَا لَمْ يَكُنْ الْآخَرُ فِي هَذِهِ الْحَالِ وَاجِبًا وَلَمْ يَكُنْ تَارِكُهُ لِأَجْلِ فِعْلِ الْأَوْكَدِ تَارِكَ وَاجِبٍ فِي الْحَقِيقَةِ. وَكَذَلِكَ إذَا اجْتَمَعَ مُحَرَّمَانِ لَا يُمْكِنُ تَرْكُ أَعْظَمِهِمَا إلَّا بِفِعْلِ أَدْنَاهُمَا لَمْ يَكُنْ فِعْلُ الْأَدْنَى فِي هَذِهِ الْحَالِ مُحَرَّمًا فِي الْحَقِيقَةِ وَإِنْ سُمِّيَ ذَلِكَ تَرْكُ وَاجِبٍ وَسُمِّيَ هَذَا فِعْلُ مُحَرَّمٍ بِاعْتِبَارِ الْإِطْلَاقِ لَمْ يَضُرَّ. وَيُقَالُ فِي مِثْلِ هَذَا تَرْكُ الْوَاجِبِ لِعُذْرِ وَفِعْلُ الْمُحَرَّمِ لِلْمَصْلَحَةِ الرَّاجِحَةِ أَوْ لِلضَّرُورَةِ؛ أَوْ لِدَفْعِ مَا هُوَ أَحرم-[10]

ابن تیمیہ کی مذکورہ بالا عبارت کا اردو مفہوم:

علاوہ ازیں، سلطان کی پکڑ ہو گی کسی ایسی زیادتی پر یا حقوق میں کسی ایسی کوتاہی پر جہاں وہ قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اس مقام پر میں یہ کہوں گا کہ: وہ آدمی جو اقتدارِ عام پر فائز ہوتا ہے یا اقتدار کی بعض فروع پر جیسے امارت، یا کسی محکمہ کی افسری، یا جج (قضاء) وغیرہ، ایسے آدمی کے لیے اگر اُس عہدے کے واجبات کو ادا کرنا یا اس میں پائے جانے والے حرام کاموں سے بچنا ممکن نہیں ہے تاہم دوسرا کوئی آدمی عمداً اور قدرت رکھتے ہوئے بھی ان امور میں پورا اترنے والا نہیں ہے، تو اس صورت میں اِس آدمی کے لیے یہ عہدہ رکھنا جائز ہو گا اور بعید نہیں یہ اُس پر واجب بھی ہو۔ وجہ یہ کہ اگر وہ عہدہ اُن واجب امور میں سے ہے جس کی مصلحتوں کو بروئے کار لانا واجب ہے جیسے دشمن کے خلاف جہاد، یا اموال فے ء کی تقسیم، یا حدود کا قیام، یا راستوں کا امن و امان: تو اس عہدے کو اختیار کرنا آدمی پر واجب ہو گا۔ پھر اگر اس عہدے پر رہتے ہوئے یہ بھی لازم آتا ہو کہ آدمی کو کسی ایسے شخص کو اختیارات تفویض کرنا پڑتے ہوں جو اس کا حقدار نہیں یا ایسا مال داخل دفتر کرنا پڑتا ہو جو جائز نہیں یا ایسے آدمی پر سرکاری خرچ کرنا پڑتا ہو جس پر وہ سرکاری اخراجات جائز نہیں؛ درحالیکہ اس کام سے بچا رہنا آدمی کے لیے ممکن ہی نہ ہو، تو ان افعال کا حکم "ما لا یتم الواجب إلا به" والا ہو جائے گا۔ یعنی یہ فقہی قاعدہ کہ: **وہ کام جس کے بغیر ایک فرض انجام نہ پا سکتا ہو فرض کے حکم میں ہی آجاتا ہے اور وہ کام جس کے بغیر ایک مستحب انجام نہ پاتا ہو مستحب کے ہی حکم میں آجاتا ہے بشرطیکہ اس کی مفسدت اُس فرض یا اُس مستحب کی مصلحت پر بھاری نہ پڑتی ہو۔** بلکہ (معاملہ اس حد تک کشادہ ہے کہ) اگر کوئی بااختیار منصب (قبول کرنا) آدمی پر واجب نہ ہو اور وہ منصب ہو بھی ظلم پر مشتمل؛ تاہم اُس منصب پر فائز جو شخص اس وقت ہے وہ تو نرا ہی ظلم مچا رکھے ہوئے ہے تا آنکہ وہی منصب کسی ایسے (خدا رسیدہ) شخص کے ہاتھ لگتا ہے جو یہ عزم رکھتا ہے کہ وہ اس ظلم کو کم ضرور کر دے گا اور ظلم کی کسی کم تر صورت کو اختیار کر کے ظلم کی شدید تر صورت کو ختم کر دے گا تو ایسی نیت کی موجودگی میں اُس شخص کے حق میں یہ فعل خوب ہو گا۔ ایسے آدمی کا ایک برائی کو اختیار کرنا اس نیت کے ساتھ کہ اس کے ذریعے وہ اس سے سنگین تر برائی کو دفع کرے گا مستحسن ہے۔ یہ وہ باب ہے جس میں عزائم اور مقاصد کے بدل جانے سے مسئلے کا حکم بدل جاتا ہے۔ **اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک بااثر ظالم کسی ناتواں شخص سے کوئی مالی تاوان طلب کرتا ہے، یہ دیکھ کر ایک تیسرا شخص بیچ میں پڑ جاتا ہے تاکہ کچھ اور نہیں تو وہ اس بیچارے سے ظلم کی شدت کو ہی کچھ کم کرا دے؛ یوں یہ شخص (تاوان جتنا کم کرا سکتا ہو کرا دینے کے بعد) اُس**

مظلوم سے وہ مال لے کر ظالم کو پہنچا دیتا ہے جبکہ خود طاقت رکھنے کی صورت میں وہ کبھی یہ ظلم کا کام اختیار نہ کرتا: تو ایسا شخص نیکوکار ہی شمار ہوگا۔ ہاں اگر یہ شخص ظالم کے حق میں بچولا بنے تو (عین یہی فعل کرکے) بدکار ٹھہرے گا۔[11]

مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ان امور میں لوگوں پر نیت اور عمل ہر دو کا فساد غالب ہے۔ نیت کا فساد یہ کہ آدمی کا ان اشیاء سے مطمحِ نظر ہی اقتدار یا مال کا حصول ہو۔ اور عمل کا فساد یہ کہ آدمی حرام کاموں کا ارتکاب کرتا ہے اور واجبات کا ترک کرتا ہے کسی (حسنات وسیئات کے) تعارض کے باعث نہیں اور نہ اس غرض سے کہ وہ کوئی مفید تر اور خوب تر خدمت انجام دے۔

علاوہ ازیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی عہدہ (اپنی عمومی حیثیت میں) جائز یا مستحب یا واجب ہو لیکن کسی خاص آدمی کے حق میں اُس کے ماسوا کوئی عہدہ اس سے بھی بڑھ کر واجب یا مطلوب ہو۔ پس اس صورت میں اس کو دو خوب چیزوں میں سے خوب تر کو ترجیح دینا ہوگی کسی وقت از راہِ وجوب اور کسی وقت از راہِ استحباب۔

اسی باب میں یوسف الصدیق علیہ السلام کا بادشاہِ مصر کے ہاں خزائن الارض کا عہدہ قبول کرنا بلکہ طلب کرکے لینا آتا ہے، درحالیکہ وہ بادشاہ اور اس کی قوم کفار تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ذکر فرماتا ہے {وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ "اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس آیا تھا صاف نشانیاں لے کر پھر تم اس کے لائے ہوئے کی بابت شک ہی میں رہے"} نیز یہ الفاظ: { يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ "اے میرے زنداں کے دونوں ساتھیو! کیا بہت سے متفرق خدا بہتر ہیں یا اللہ اکیلا قہار۔ نہیں پوجتے تم اسے چھوڑ کر مگر کچھ نام جنہیں تم نے اور تمہارے آباء نے اختیار کر لیا ہے"}۔ پھر علاوہ اُن (اہل مصر) کے کفار ہونے کے، یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ لازماً اُن (اہل مصر) کا کوئی معمول اور کوئی دستور ہو مالیات کی وصولی کے معاملے میں بھی اور مالیات کے مصارف کے معاملہ میں بھی جو کہ بادشاہ کے درباریوں پر بھی خرچ کیے جاتے ہوں گے اور اس کے اہل خانہ پر بھی اور اُس کے لاؤ لشکر پر بھی اور اس کی رعایا پر بھی، اور (اہل مصر کے) یہ اخراجات اُس دستور پر رائج نہ ہوں گے جو کہ انبیاء کی سنت اور ان کے عدل کی شان ہے۔ جبکہ یوسف علیہ السلام کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام امور انجام دے لیں جو وہ چاہتے ہیں اور جنہیں وہ دینِ خداوندی کا حصہ جانتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اُن

لوگوں نے ابھی یوسف علیہ السلام کی دعوت پر لبیک ہی نہیں کہہ رکھا ہوا تھا۔ لیکن جتنا بس میں تھا اتنا عدل اور احسان یوسف علیہ السلام نے ضرور کیا۔ نیز اس اقتدار سے کام لے کر اپنے خاندان کے اہل ایمان کو اعزاز واکرام دینے میں کامیاب رہے جو کہ اس کے بغیر وہ نہ دے سکتے تھے۔ یہ سب اللہ رب العزت کے اس قول میں داخل ہے: فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے بس میں ہے"۔ پس جب دو فرض آپس میں ٹکرائیں اور دونوں میں جمع ممکن نہ ہو اور ایسی صورت میں دونوں میں سے اہم فرض کو مقدم کر دیا جائے تو وہ دوسرا فرض (جو چھوٹ گیا) اُس صورت میں فرض ہی نہ رہے گا، اور اس کا تارک جو کہ اُس سے اہم تر فرض کو ادا کرنے کے باعث اس کا تارک ہوا بلحاظِ حقیقت تارکِ فرض نہ ہو گا۔ اسی طرح؛ جب دو گناہ کے کام اکٹھے ہو جائیں اور ان میں سے زیادہ بڑے گناہ سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو سوائے اس کے کہ ان دونوں میں سے چھوٹے گناہ کو اختیار کر لیا جائے، تو ایسی صورت میں چھوٹا گناہ بلحاظِ حقیقت گناہ نہ ہو گا۔ ایسی صورت میں وہ جو ترکِ واجب ہوا تھا اُسے ایک عمومی معنیٰ میں ترکِ واجب کہہ بھی لیا جائے، یا یہ جو ارتکاب حرام ہوا ہے اُسے ایک عمومی معنیٰ میں ارتکاب حرام کہہ بھی لیا جائے، تو مضائقہ نہیں۔ ایسی صورت میں جو (صحیح تر) لفظ بولا جائے گا وہ ہے: ترکِ واجب بہ سببِ عذر، یا ارتکاب حرام بہ سبب مصلحتِ راجحہ یا ضرورۃ۔ یا یہ کہ ایک حرام کو اختیار کرنا اس لیے کہ اس سے بڑے حرام کو دفع کرنا ہے۔

ابن تیمیہ کی عبارت ختم ہوئی۔

نوٹ: ہمارا یہ مضمون، ہمارے پچھلے شمارہ کے ایک مضمون پر سوشل میڈیا کے ذریعے موصول ہونے والے کچھ اعتراضات کے جواب میں انٹرنیٹ پر کچھ عرصہ پہلے شائع کر دیا گیا تھا۔ اس پر مزید کچھ اعتراضات ہمیں موصول ہوئے ہیں، جنکی ایک خوبی یہ ہے کہ اب وہ اعتراضات ہماری بجائے براہِ راست ابن تیمیہ پر ہو گئے ہیں۔ ان اعتراضات میں مذکورہ بعض نکات پر ہم ان شاءاللہ آئندہ کسی فرصت میں قلم اٹھائیں گے۔

---

[1] http://eeqaz.org/eeqazarticles.aspx?sanid=1291&articlename=2013_04_darmyani_mahrlay

[2] ابن تیمیہ اس کے لیے لفظ "ولایت" استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ آپ ان کے فتویٰ کے عربی متن میں دیکھ لیں گے۔ "ولایت" کا لفظ کسی عام سی نوکری پر نہیں بولا جاتا۔ مثلاً ایک چپڑاسی یا کلرک کی نوکری کو "ولایت" نہیں کہا جائے گا، حتیٰ کہ 'شعبۂ تعلیم کی ملازمت' کے لیے بھی لفظ "ولایت" بعید از استعمال

ہے۔ یہ لفظ صرف ایک اعلیٰ اختیاراتی منصب کے لیے ہی بولا جاتا ہے۔ عربی لغت سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا۔ ولایت رکھنے یا سونپے جانے والے شخص کو "والی" کہا جائے گا، جو کہ کسی حد تک اردو میں بھی مستعمل ہے۔

[3] http://eeqaz.org/eeqazarticles.aspx?sanid=1291&articlename=2013_04_darmyani_mahrlay

[4] "تفہیمات" میں مودودی صاحب نے یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ پر طویل کلام کیا ہے۔ ایک زمانے تک ہم بھی امام مودودیؒ کے اس تحریری مناظرے کو بے حد سراہتے رہے ہیں کیونکہ مقابلے پر جو صاحب ہیں وہ شرک اور باطل کی بیخ کنی کے حوالے سے فی زمانہ کوئی مقدمہ ہی نہیں رکھتے۔ تاہم جب سے ہمیں مدرسۂ ابن تیمیہ کی چیزیں پڑھنے کو ملیں ہم ان مباحث سے ویسے ہی مستغنی ہو گئے۔

[5] http://eeqaz.org/eeqazarticles.aspx?sanid=1291&articlename=2013_04_darmyani_mahrlay

[6] سماجی صلاحیتوں کے حوالے سے ہم اپنے پہلے مضمون میں بھی ایک وضاحت دے آئے ہیں۔ یہاں بھی اُس وضاحت کے بغیر شاید ہمارا یہ موضوع مبہم رہے:

ہماری یہ گفتگو ایک ایسی جمعیت سے متعلق ہے جو اعلیٰ سماجی صلاحیتوں کی مالک ہو اور معاشرے پر اثر انداز ہونے کی ایک قوی استعداد رکھتی ہو، اور جو کہ ہمارے خیال میں سید مودودیؒ کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور جو کہ تھوڑی دیر میں معاشرے کے سب موثر فورمز پر بولنے لگی تھی مگر رفتہ رفتہ اس میں باطل کے خلاف اختیار کیے گئے زوردار لہجے (پیراڈائم کی اُس تبدیلی کے باعث) دھیمے پڑتے چلے گئے اور بالآخر دم توڑ گئے۔ ایک ایسا تحریکی عمل بڑی دیر تک معاشرے کے موثر فورمز سے دوری اور گوشہ نشینی نہیں رکھ سکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ وہ معاشرے کے ہر شعبے ہر ادارے کے اندر پایا اور محسوس کیا جائے۔ ایسی باصلاحیت جمعیت کی بابت ہم نے کہا کہ وہ زیادہ عرصہ اداروں سے دور رہے گی تو معاشرے سے آؤٹ ہو جائے گی؛ جس کی وہ کبھی متحمل نہیں ہوتی۔ رہ گئے دینداروں کے وہ چھوٹے چھوٹے مردم بیزار ٹولے جو معاشرے پر اثر انداز ہونے کی ایجد سے ہی واقف نہیں اور ان کے سب فکری مباحث کھلتے ہی کونوں کھدروں اور ڈرائنگ روموں میں ہیں اور اپنی اسی دنیا میں ملنے والی 'ترقی' پر وہ بے حد خوش ہیں...، تو اس سیاق میں وہ ہمارے زیر بحث نہیں۔ یہ، معاشرے میں کبھی 'اِن' ہی نہیں ہوئے اور نہ شاید کبھی ہوں گے ان کے 'آؤٹ' ہونے کا کیا سوال!

حضرات! سماجی صلاحیت ایک نہایت اہم چیز ہے اور تحریکی عمل کا ایک اساسی ترین عنصر؛ ہمارے تحریکی علماء بلاوجہ اس پر اتنا زور نہیں دیتے۔ خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا (مسند احمد رقم الحدیث 9922) "جاہلیت میں تم میں سے جو چنیدہ ہوں گے وہی تمہارے مابین اسلام میں چنیدہ ہوں گے، بشرطیکہ وہ (اسلام کی حقیقت جاننے میں) گہرے چلے جائیں"

[7] http://eeqaz.org/eeqazarticles.aspx?sanid=1286&ArticleName=2013_04_nazryati_sabet_gadmi

[8] http://www.eeqaz.org/index.php/guidance/fatawa/200-coeducation-fatwa

[9] http://www.eeqaz.org/index.php/guidance/suggestions/202-deen-wabsta

[10] مجموع فتاوی ابن تیمیۃ جلد 20 ص 54-57 فصل: ''فی تعارض الحسنات أو السیئات أو هما جمیعاً'' دیکھئے ابن تیمیہ کی اس عبارت کا ویب لنک:
http://shamela.ws/browse.php/book-7289#page-9872

[11] یہ ہے وہ حقیقی فقہ جو اللہ کے فضل سے ہمارے ائمہ سنت کو نصیب رہی ہے۔